(غلام گردش)

42-B، بہاولپور ہاؤس

چھبیس برس پہلے بہاولپور سے لاہور پوسٹنگ ہوئی۔اس شہرِ نایاب میں پورے تین سال انتظامی عہدے پر فائز رہا تھا۔اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ میرا تعلق بہاولپور سے ہی ہے۔حالانکہ فیصل آباد کی مٹی میں گھندا ہوا انسان ہوں۔خیر لاہور آیا تو سب سے پہلے تکلیف دہ احساس یہ ہوا کہ رہنے کیلئے چھت نہیں ہے۔سرکاری ملازم کے اندر یہ احساس،ایک خوف کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔نوے فیصد حکومتی اہلکار چھت کی تگ ودو میں زندگی گزار دیتے ہیں یا شائد ضائع کر دیتے ہیں۔ویسے ضائع کا لفظ زیادہ موضوع ہے۔کیونکہ سرکار کی چاکری باہر سے بہت دیدہ زیب اور خوبصورت نظر آتی ہے مگر اندر سے انتہائی ادنیٰ اور مہمل سی ہے۔بے یقینی کی کیفیت سے لبریز۔بہرحال لاہور آ کر کچھ عرصے بعد سرکاری گھر مل گیا۔الائمنٹ لیٹر پر گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ 42-B، بہاولپور ہاؤس G.O.R II۔بہاولپور شہر سے آنے کے بعد بہاولپور ہاؤس کا لفظ انتہائی مانوس سا معلوم ہوا۔خیر پوچھتا پُچھاتا،جب پہنچا تو مکمل طور پر اَبتر حالت میں سرکاری گھر پایا۔رقبہ میں کشادہ مگر اندر سے انتہائی خستہ حال۔پہلے تو دل چاہا کہ گھر نہ لوں اور حکومت کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دوں۔مگر پھر ایک دوسرا بلکہ متضاد خیال اُبھرا کہ نہیں،اسی کو ٹھیک کروا کر رہنا چاہیے۔دوسرے فیصلے پر قائم رہا۔

تین مہینے اس گھر کی مرمت نے صورتحال بھرپور طریقے سے بدل دی۔یہ ایک سرکاری گھر سے واقعی ایک گھر میں تبدیل ہو گیا۔جس دن منتقل ہوا تو پورے جی او آر میں کسی بھی رہائش گاہ کے باہر پکی دیوار نہیں تھی۔حفاظت کے لحاظ سے معاملات اتنے بہتر تھے کہ دہائیوں سے تعمیر شدہ اس کالونی میں کسی بھی مکین نے چار دیواری بنوانے کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا۔خیر یہ ایک ابتدائی تاثر تھا۔ابھی گھر میں رہتے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہوا تھا کہ لاہور میں دہائی کی سب سے بھرپور بارش ہوئی۔یہ 1996 کی بات ہے۔گھر کے باہر لان میں دو دو فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔عمارت میں پانی نہ آیا۔رحمت کو کافی حد تک زحمت بنتے دیکھا۔جب بارش عروج پر تھی تو اسی دن بڑے بیٹے مبارز حیات کا ایچیسن کالج میں داخلے کا ٹیسٹ تھا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ بچے کو گھر سے باہر نکال کر،صحیح حالت میں گاڑی تک کیسے پہنچایا جائے۔اس زمانے میں ڈپٹی سیکرٹری تھا۔محکمہ زراعت میں۔ایک سرکاری جیپ ملی ہوئی تھی جسے عرم عام میں ڈبل کیبن کہا جاتا ہے۔وہ برآمدے کے ساتھ کھڑی کی۔مبارز کو گود میں اُٹھایا اور پانی میں چلتا ہوا جیپ کے اندر بٹھا دیا۔احتیاط اسلیے ضروری تھی کہ اسکے کپڑوں پر چھینٹے نہ پڑیں تاکہ سکول میں انٹرویو کے مراحل میں کوئی منفی تاثر نہ اُبھرے۔خیر یہ مرحلہ احسن طریقے سے طے ہو گیا۔مبارز کو بغیر کسی سفارش کے ایچیسن کالج میں داخلہ مل گیا۔خیر اب تو مبارز بڑا ہو گیا ہے۔اکثر اوقات احساس ہی نہیں ہوتا کہ بچے کتنی جلدی جوان ہو جاتے ہیں۔یا دوسرے لفظوں میں ماں باپ کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔باپ تو خیر بہت جلد بزرگی کی راہ پر سفر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ذمہ داریاں اُٹھاتے اُٹھاتے شائد جوانی میں ہی بہت زیادہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔اب تو خیر مبارز ملک سے باہر آئی ٹی کی ایک بین لاقوامی کمپنی میں کام کر رہا ہے۔اسے یاد ہی نہیں ہوگا کہ جس دن اسکا داخلہ ایچیسن کالج میں ہوا تھا،اس دن میں نے گود میں بٹھا کر بارش میں اسے محفوظ طریقے سے گاڑی میں بٹھایا تھا۔پتہ نہیں کیوں،کہ جیسے جیسے انسان عمر رسیدہ

ہوتا جاتا ہے، اولاد کو گھر میں نہ دیکھ کر بے چین سا ہو جاتا ہے۔ اگر بیٹے یا بیٹیاں ملک سے باہر ہوں تو پورا سال گن گن کر انکے واپس آنے کی راہ دیکھتا ہے۔ دو چار ہفتے میں ان سے دوبارہ مانوس ہو جاتا ہے تو انکی چھٹیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک دھچکا سا لگتا ہے کہ مہینہ اتنی جلدی کیسے گزر گیا۔ مبارز جب واپس چلا جاتا ہے تو میں پورا سال روزانہ اسکے پاکستان آنے کا انتظار کرتا ہوں۔ ایک ایسا تکلیف دہ انتظار جسے کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتا۔

جب میں 42-B میں منتقل ہوا تو حمزہ صرف تین سال کا تھا۔ اسکے لیے تو یہ پہلا گھر تھا۔ نہیں دوسرا۔ کیونکہ میں جب سرکاری گھر کے ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو نہر کے نزدیک ایک کشادہ سا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ اس میں تقریباً ایک برس رہنے کا موقعہ ملا۔ خیر حمزہ کو ہوش 42-B میں ہی آیا۔ اس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ اپنی طبیعت کے مطابق کافی وقت لان میں کھیلتا رہتا تھا۔ اسی گھر سے حمزہ بھی ایچیسن کالج میں گیا اور پھر باہر پڑھنے چلا گیا۔ اب تو وہ بہت لمبا ہو گیا ہے۔ میرے سے بھی چار پانچ انچ لمبا۔ اسکے لئے تو یہ رہائش گاہ ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ 42-B آنے کے بعد، میں نے اسکے لانز پر بے حد محنت کی۔ شائد میں کافی حد تک غلط لکھ گیا ہوں لانز پر اصل محنت میری اہلیہ نے کی۔ اس نے ہر طرح کے خوبصورت پودے لگا کر چمن کو اس قدر خوبصورت بنا دیا کہ کئی بار دل چاہتا تھا کہ باہر بیٹھا جائے۔ سردیوں میں اکثر ہم لوگ باہر ہی بیٹھے تھے۔ وقت بڑی تیزی سے گزرتا گیا۔ چار پانچ برس رہنے کے بعد، اس گھر میں ایک بڑا کمرہ اور ایک لاؤنج مزید بنوالیا۔ اب یہ حد درجہ کشادہ اور آرام دہ ہو چکا تھا۔ میرے اکثر دوست کہتے تھے کہ یہ جی او آر کا سب سے اچھا گھر ہے۔ خیر میں یہ دعوی نہیں کر سکتا۔ بہر حال میں اور میری اہلیہ نے اس پر کافی محنت کی ہے۔ اکیس برس پہلے جس حالت میں یہ گھر ملا تھا، آج اس سے بہت زیادہ بہتر حالت میں ہے۔

اکیس یا شائد بائیس برس میں، اسی گھر میں میرے چھوٹے بھائی مبشر کی شادی کی رسومات بھی ہوئیں۔ والدہ حیات تھی۔ آج تک یاد ہے کہ مبشر کی شادی پر وہ کتنی خوش مگر اندر سے کتنی غمگین تھیں۔ جج صاحب انتقال کر چکے تھے۔ ہم سب اپنے والد کی کمی کو بے حد محسوس کر رہے تھے۔ والدہ ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ مگر بہر حال انکو اس موقع پر اکیلے ہونے کا احساس مکمل طور پر موجود تھا۔ ہاں، ایک بات۔ جج صاحب اس گھر میں کبھی نہیں آئے تھے۔ اسلیے کہ وہ بہت جلدی انتقال کر چکے تھے۔ ویسے انکی عادت ایسی تھی کہ فیصل آباد میں اپنے گھر میں رہنا ہی بہت پسند کرتے تھے۔ عجیب مرد درویش تھے۔ اتنے بڑے سرکاری عہدہ پر رہنے کے باوجود، پیسے کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ جب ریٹائر ہوئے تو والدہ نے بہت مشکل سے فیصل آباد والا گھر بنایا۔

دس برس پہلے، جب والدہ کو فالج ہوا، تو انکی طبیعت کے خلاف، انہیں اسی سرکاری گھر میں لے آیا۔ خیال تھا کہ انکا علاج لاہور میں بہتر طریقے سے ہوگا۔ ویسے یہ فیصلہ درست نکلا۔ گھر کے ایک کمرے کو ہسپتال بنا دیا۔ ہر طرح کی طبی سہولتوں سے آراستہ۔ کوشش کی کہ انہیں اپاہج ہونے کا احساس نہ ہو۔ مجھے نہیں اندازہ کہ میں کس حد تک کامیاب ہوا۔ مگر جب بھی انکے کمرے میں جاتا تھا تو وہ عبادت کرنے کے دوران بھی مجھے دیکھ کر ہلکے طریقے سے مسکرانا شروع کر دیتی تھی۔ جب کبھی لاہور سے اُکتا جاتیں، تو پھر فیصل آباد، اپنے گھر چلی جاتیں۔ میری ضد کرنے پر پھر واپس آجاتیں۔ گھر کا یہ کمرہ میرے لیے آج بھی ایک مسجد کی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنی عبادت اپنی والدہ کو اس

جگہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، بیان نہیں کرسکتا۔ فالج کے دوران بھی تمام روزے رکھتی تھیں۔ تمام نمازیں اور تہجد بھی ادا کرتی تھی۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ شائد وہ اسی کمرے میں موجود ہیں، میں موجود نہیں ہوں۔ انکی وفات کے بعد اسی کمرے میں ایک میز لگا دی۔ اسی ٹیبل پر اپنے کالم لکھتا ہوں۔ بلکہ یہ کالم بھی وہیں لکھ رہا ہوں۔

پرندے رکھنے کا بہت شوق ہے۔ یہ مناسب سا شوق، اسی مکان میں پورا ہوا۔ مور، کونجیں رکھتا رہا۔ انکا ایک پنجرہ پچھلے لان کے کونے میں بنوا دیا۔ تمام پرندے دن میں باہر پھرتے رہتے اور شام ہوتے ہی اپنے مسکن کی طرف چلے جاتے۔ خود بخود پنجرے میں بیٹھ جاتے۔ ویسے پرندے ہی کیا، تمام انسان بھی شام کو اپنے مسکن کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ نہ پرندوں کو اس اَمر کا احساس ہوتا ہے کہ انکا مسکن عارضی ہے اور نہ ہی انسانوں کو۔ ایک زمانے میں میرے ماموں زاد بھائی مجاہد نے مجھے دو ہرن بھی بھجوا دیے۔ انکو گھر میں رکھنے کا لائسنس بھی ساتھ تھا۔ دونوں ہرن بے حد خوبصورت تھے۔ خصوصاً، نر کے سینگ، اس درجہ دلکش تھے کہ اسے چلتا دیکھ کر مسحور ہو جاتا تھا۔ یہ بھی شام کو پنجرے میں چلے جاتے تھے۔ شروع شروع میں مشکل پیش آئی مگر دو چار ہفتے کے بعد، یہ بھی دوسرے پرندے اور جانوروں کے عادی ہو گئے۔ انہوں نے بھی پنجرے کو اپنا گھر گردان لیا۔ تھوڑے عرصے بعد، ہرنی بیمار ہو گئی۔ اسے جانوروں کے ہسپتال میں لے گیا۔ دوائیاں دینے کے باوجود زندہ نہ رہ سکی۔ اکیلے ہرن کو دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی۔ چنانچہ اسے جلو پارک کے چڑیا گھر کو تحفے کے طور پر دیدیا۔ اب تک سوچتا ہوں کہ وہ ہرن کس حال میں ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا۔ شائد وہ بھی اس گھر کے متعلق کبھی کبھی سوچتا ہوگا۔ معلوم نہیں، یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

اکیس سال کے بعد سرکاری گھر چھوڑ رہا ہوں۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ میں نے دوبار لگوائی ہے۔ اسکے ایک ایک پودے اور درخت پر میرے اور میرے خاندان کی انسیت کے نشان ہیں۔ اسکی مٹی کا ایک ایک ذرہ میرے وجود کا حصہ ہے۔ میں نے اسے جس حالت میں لیا تھا، آج اس سے حد درجہ بہتر حالت میں حکومت کو واپس کر رہا ہوں۔ شائد زیست ہے ہی یہی۔ شائد زندگی کا مقصد بھی یہی ہے۔ شائد میری سوچ بھی یہی ہے۔ جو بھی چیز آپکو ملے، اسے اپنے بعد آنے والوں کیلئے بہتر حالت میں چھوڑ کر جائیں۔ لیکن ایک اور نکتہ بھی ہے۔ انسیت بلکہ شدید انسیت کے باوجود، انسان کو ہر جگہ چھوڑ کر جانی ہوتی ہے۔ یہی زندگی کا پیہم اُصول ہے اور اسی کے سہارے ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اتنا عرصہ گزارنے کے بعد، گھر چھوڑتے ہوئے غم تو ہوتا ہے، ایک عجیب سا دکھ جو شائد بتایا نہیں جا سکتا۔ میں تو بالکل ہی نہیں بتا سکتا! خدا حافظ، B-42۔

راؤ منظر حیات